طرف سوتا پڑا تھا۔ رتن کے دل پر خوف طاری ہو گیا یہ منحوس رات کبھی ختم بھی ہو گی یا نہیں۔

کئی منٹ کے بعد وکیل صاحب کی سانس رُکی، سارا جسم پسینے میں تر تھا، ہاتھ سے رتن کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحہ میں انہوں نے ایک خفیف آواز میں کہا۔ رتن اب جدائی کا وقت آ گیا۔ میری خطائیں ...... انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور رتن کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھا۔ کچھ لکھنا چاہتے تھے مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ رتن نے چیخ کر پکارا۔ کیا ٹمیل مہراج دونوں مر گئے

مہراج نے آکر کہا۔ میں سو یا تھوڑے بہو جی۔ بابوجی کی حالت ......

رتن نے ڈانٹ کر کہا۔ بکو مت جا کر کبیراج کو بلا لاؤ۔ کہنا ابھی چلئے۔

مہراج نے فوراً اپنا پُرانا اور کوٹ ڈاٹا۔ سوٹا اٹھایا اور چل دیئے۔ رتن اٹھ کر آگ جلانے لگی کہ شاید سینک سے کچھ فائدہ ہو۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر اس میں یاس کی ہمت پیدا ہوئی۔ سارا گھبراہٹ سارا ضعف دور ہو گیا۔ اس کی جگہ اعتماد کی قوت پیدا ہوئی۔ فرض کے احساس نے اس کے سارے ادراک کو بیدار کر دیا۔ اسٹو جلا کر اس نے روئی کے گالوں سے وکیل صاحب کی چھاتی کو سینکنا شروع کیا۔ کوئی پندرہ منٹ تک متواتر سینکنے کے بعد وکیل صاحب کی سانس کچھ رکی۔ رتن کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ کر بولے تمہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ رتن میں کیا جانتا تھا یہ وقت اتنی جلد آجائیگا میں نے تمہارے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ کتنا وحشیانہ ظلم۔ میں نے تمہاری زندگی غارت کر دی میری خطاؤں کو معاف کرنا۔

یہی آخری الفاظ تھے جو ان کے منہ سے نکلے۔ یہی زندگی کا آخری رشتہ تھا۔ یہی بزمِ حیات کا آخری دور۔ رتن نے مایوس نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک مہراج کا پتہ نہ تھا۔ ہاں ٹمیل کھڑا تھا۔

رتن نے کہا۔ ٹمیل ذرا پانی گرم کر دو گے۔

ٹمیلا نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ پانی گرم کیا کروگی بہوجی۔ گئو دان کرادو۔ دو بوند گنگا جل منہ میں ڈال دو۔ رتن نے مرنے والے کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ گویا ٹمیلا کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ وکیل صاحب کا سینہ گرم تھا۔ اس نے پھر منتظر آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مہراج نظر نہ آئے وہ اب بھی سوچ رہی تھی کہ مہراج آجاتے تو شاید ان کی حالت سنبھل جاتی۔ پچھتا رہی تھی کہ ان کو یہاں کیوں لائی۔ شاید راستے کی تھکان اور آب و ہوا کی تبدیلی نے مرض کو لاعلاج کر دیا۔ یہ پچھتاوا ابھی ہو رہا تھا کہ میں شام کو سیر کرنے چلی گئی شاید اتنی ہی دیر میں انہیں سردی لگ گئی ہو۔

لیکن پچھتاوے کی یہی باتیں نہ تھیں۔ اس آٹھ سال کی زندگی میں میں نے انہیں کیا آرام پہونچایا۔ وہ بارہ بجے رات تک قانونی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ میں پڑی سویا کرتی تھی۔ وہ موکلوں سے معاملہ مقدمہ کی باتیں کرتے تھے۔ میں باغیچہ اور بازاروں کی سیر کیا کرتی تھی۔ میں نے انہیں کسب دولت کا محض ایک آلہ سمجھ لیا۔ وہ کتنا چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں اور باتیں کروں۔ لیکن میں بھاگتی تھی میں نے کبھی ان کے دل کے قریب جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اپنے گھر میں چراغ نہ جلا کر دوسروں کے اُجالے گھر کا لطف اٹھاتی رہی۔ تفریح کے سوا مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اپنے جلے ہوئے دل کو یوں تسکین دے کر میں خوش تھی کہ کھیر اور ملائی کی تھالی مجھے کیوں نہ ملی۔ اس غم میں میں نے اپنی روٹیوں کو لات مار دی۔

آج رتن کو اس محبت کا کامل ثبوت ملا۔ جو مرنے والے کے دل میں تڑپتی رہتی تھی۔ رتن کے لئے تو زندگی میں پھر بھی کچھ دلچسپی تھی۔ ان کے لئے زندگی میں کونسا آرام تھا زندگی کیا ایک مستقل ریاضت تھی جس کا خاص مقصد تکمیل فرض تھا کیا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان فکروں سے انہیں آزاد نہ کر سکتی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دلجوئی اور مزاج شناسی سے یہ بجھنے والا چراغ کچھ دن اور روشن رہتا۔ لیکن اس نے شوہر کے ساتھ اپنے فرض کا کبھی

خیال ہی نہ کیا۔ اس کا دل ہمیشہ بغاوت پر کمربستہ رہا، محض اس لئے کہ ان سے میرا تعلق کیوں ہوا۔ رتن کا ضمیر اس وقت اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے احساس سے پامال ہو رہا تھا۔ اس نے شوہر کے بے جان قدموں پر سر جھکا دیا اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ سارے باغیانہ جذبات جو اس کے دل میں اٹھتے رہتے تھے وہ سارے ناہمدردانہ خیالات جنہیں وہ بار بار دبانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس وقت سینکڑوں بچھوؤں کی طرح ڈنگ مار رہے تھے ہائے میرا یہ برتاؤ اس آدمی کے ساتھ تھا جس نے اپنے تئیں مجھ پر قربان کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کر کے اس کا دل پھٹا جاتا تھا۔ ان قدموں پر سر رکھے ہوئے اسے یہی آرزو ہوتی تھی کہ اسی وقت میری جان نکل جائے۔ ان قدموں کو اپنی پیشانی سے سہلاتے ہوئے آج اس کے دل میں کتنا ایثار دوڑ آتا تھا کہ گویا مدتوں کی اندوختہ دولت کو وہ آج ہی اسی وقت لٹا دے گی۔ موت کی نورانی ضیاء کے سامنے اس کے باطن کی ساری کدورتیں مٹ گئیں۔

وکیل صاحب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن چہرے پر کسی جذبہ کے آثار نہ تھے، رتن کی بے خودی بھی ان کے بجھتے ہوئے ادراک کو روشن نہ کر سکتی تھی۔ شادی اور غم کی بندشوں سے وہ آزاد ہو گئے تھے۔ اور کوئی روئے غم نہیں، ہنسے تو خوشی نہیں۔ ٹمبل نے اچمنی میں گنگا جل لے کر ان کے منہ میں ڈال دیا۔ آج انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ جو رسوم اور معتقدات کا دشمن تھا اس وقت خاموش ہو گیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس میں مذہبی اعتقاد رونما ہو گیا تھا بلکہ اس لئے کہ اس میں اب کوئی حس نہ تھا۔ اتنے ہی توکل سے وہ زہر کا گھونٹ بھی پی جاتا۔

انسانی حیات کا اہم ترین واقعہ کتنی خاموشی کے ساتھ ظہور پذیر ہو جاتا ہے وہ کائنات کا ایک رکن اعظم وہ تمناؤں کا طوفان سمندر، وہ سعی و عمل کا لافانی مخرج، وہ محبت اور حسد، خوشی اور رنج کا جولان گاہ۔ وہ عقل شعور کی رنگ ہجوم نہ جانے کب اور کہاں غائب ہو جاتی ہے کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ایک ہچکی بھی نہیں، ایک سانس بھی نہیں، ایک آہ

بھی نہیں نکلتی، سمندر کی موجوں کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے۔ کون بتا سکتا ہے آواز فضا میں کہاں مدغم ہو جاتی ہے۔ کون جانتا ہے حیاتِ انسانی اس موج کے سوا، اس آواز کے سوا اور کیا ہے۔ اس کی تحلیل بھی اتنی پرسکون، اتنی ہی غیر محسوس ہو۔ کیا تعجب ہے عناصر کے معتقد پوچھتے ہیں کیا چیز نکل گئی۔ طبیعات کا معتقد کہتا ہے ایک خفیف سی چمک نکل جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے آنکھوں سے جان نکلی۔ کوئی منہ سے۔ کوئی ان سے پوچھے موجیں فنا ہوتے وقت کیا چمک اٹھتی ہیں۔ آواز غائب ہوتے وقت کیا مجسم ہو جاتی ہے، وہ فنا اس ابدی سفر کی محض ایک منزل ہے جہاں سفر کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی توسیع ہوتی ہے۔

کتنا حیرت انگیز انقلاب ہے، وہ جو مچھر کے ڈنگ کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اب اسے چاہے مٹی میں دبا دو، خواہ آگ کی چتا پر رکھ دو، اس کی پیشانی پر شکن نہ آئے گی۔

ٹیل نے وکیل صاحب کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ بہو جی آیئے۔ مالک کو کھاٹ سے اتار دیں وہ چلے گئے۔

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ آج اس کی تیس سال کی رفاقت ختم ہو گئی جس نے کبھی آدھی بات نہیں کہی۔ کبھی تو کر کے نہیں پکارا، وہ مالک اب اسے چھوڑے چلا جا رہا ہے۔

رتن ابھی تک کیراج کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے دھکا سا لگا اس نے اٹھ کر وکیل صاحب کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ ساٹھ سال کی مسلسل حرکت کے بعد وہ اس وقت خاموش تھی۔ رتن کو پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس جسم کو چھوتے ہوئے اس بے جان چہرہ کی طرف تاکتے ہوئے اسے کچھ احتراز ہو رہا تھا جو استکراہ سے مشابہ تھا۔ ابھی جن قدموں پر سر رکھ کر وہ روتی تھی اسے چھوتے ہوئے انگلیاں کٹی سی جاتی تھیں۔ رشتۂ حیات اتنا نازک ہے اس نے ایسا کبھی نہ سمجھا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد ٹیل نے کہا۔ بہو جی اب کیا دیکھتی ہو، کھاٹ کے نیچے اتار دو، جو

ہونا تھا ہوگیا۔

اس نے پیر پکڑا، رتن نے سر پکڑا اور لاش کو نیچے لٹا دیا۔ تب وہیں زمین پر بیٹھ کر رتن رونے لگی۔ اس لئے نہیں کہ دنیا میں اب کوئی اس کا دستگیر نہ تھا بلکہ اس لئے کہ وہ اس کے ساتھ اپنا فرض پورا نہ کرسکی۔

اسی وقت موٹر کی آواز آئی اور کبیراج نے کمرہ میں قدم رکھا۔

شاید اب بھی رتن کے دل میں اُمید کی کوئی بجھتی ہوئی چنگاری چھپی پڑی تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھ ڈالیں، سر کا آنچل سنبھال لیا۔ اُلجھے ہوئے بال سمیٹ لئے اور کھڑی ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کبیراج سے کچھ پوچھتے ہوئے اس کی روح کانپ رہی تھی۔

نورِ سحر نے آسمان کو اپنی سنہری کرنوں سے رنگین کر دیا تھا۔ کیا اس وجود کی خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

(۳۱)

اسی دن لاش کاشی لائی گئی۔ وکیل صاحب کے ایک بھتیجے مالوہ میں رہتے تھے انہیں تار دے کر بلایا گیا۔ آخری مراسم انہوں نے ادا کئے۔

جالپا آجکل سارے دن رتن کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بدنصیب رتن کو نہ گھر بار کی سُدھ تھی نہ کھانے پینے کی۔ روز ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد آجاتی جس سے رونے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ شوہر کے ساتھ اس کے جو فرائض تھے اس کے ایک حصّے کی بھی اس نے تعمیل کی ہوتی۔ تو اسے تسکین ہوتی۔ اپنی بیدردی، اپنی نا فرض شناسی، اپنی آرائش پسندی کے چرچے کر کے ہی وہ اپنے ضمیر کو تشفی دیتی تھی۔ جب تک اس کی زندگی کے دروازے پر ایک محافظ بیٹھا ہوا تھا اُسے کسی کُتّے بلّی یا چور کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن اب دروازہ پر کوئی محافظ نہ تھا۔ اس لئے وہ ہشیار رہتی تھی۔ شوہر کا ذکر خیر کرتی رہتی تھی۔ گزر بسر کیسے ہوگی۔ نوکروں چاکروں میں کس کس

کا جواب دینا ہوگا۔ گھر کے کون کون سے خرچ کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مسئلوں کے متعلق کوئی گفتگو ہی نہ ہوتی۔ گویا یہ فکر مرنے والے کی روح کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ کھانا صاف کپڑا پہننا اور کچھ پڑھ کر دل بہلانا بھی اُسے غیر مناسب سا معلوم ہوتا تھا۔ شرادھ کے دن اس نے اپنے سارے کپڑے اور زیور مہا برہمن کو دے ڈالے۔ ان چیزوں کی اب اسے کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس شوہر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ان کی نشانی سمجھ کر وہ دیکھتی بھالتی رہتی تھی۔ اس کا مزاج اتنا متحمل ہوگیا تھا کہ کتنا ہی بڑا نقصان ہو جائے اسے غصہ نہ آتا تھا ٹمیل کے ہاتھ سے چائے کا سیٹ چھوٹ کر گر پڑا۔ لیکن رتن جیں بہ جبیں بھی نہیں ہوئی۔ پہلے ایک دوات ٹوٹ جانے پر اس نے ٹمیل کو اس بُری طرح ڈانٹ بتائی تھی، مگر آج اس سے کئی گنے بڑے نقصان پر اس نے زبان تک نہ کھولی۔

وکیل صاحب کے بھتیجے کا نام تھا منی بھوشن۔ بڑا ملنسار، خوش مزاج اور کارگزار اسی ایک مہینہ میں اس نے صدہا دوست بنا لئے، شہر میں جن جن وکیلوں اور رئیسوں سے وکیل صاحب کا یارانہ تھا۔ ان سبھی نے ایسا میل جول بڑھایا ایسی بے تکلفی پیدا کی کہ رتن کو خبر تک نہ ہوئی۔ اور اس نے بینک کا لین دین اپنے نام سے شروع کر دیا۔ الہ آباد بینک میں وکیل صاحب کے پچیس ہزار روپے جمع تھے ان پر تو اس نے قبضہ کر ہی لیا، مکانوں کے کرایہ بھی خود ہی وصول کرنے لگا۔ مواضعات کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ گویا رتن سے کوئی مطلب ہی نہیں۔

ایک دن ٹمیل نے رتن سے آکر کہا۔ بہوجی جانے والا تو چلا گیا اب گھر بار کی بھی کچھ خبر لیجئے۔ میں نے سنا ہے بھیا نے بینک کا سب حساب اپنے نام کر لیا۔

رتن نے اس کی طرف ایسی غضبناک آنکھوں سے دیکھا کہ پھر اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی دن شام کو منی بھوشن نے ٹمیل کو نکال دیا، چوری کا الزام لگا کر نکالا۔ جس میں رتن کچھ کہہ بھی نہ سکے۔

اب صرف مہراج رہ گئے۔ انہیں منی بھوشن نے بھنگ پلا پلا کر ایسا ملایا کہ وہ انہیں کا دم بھرنے لگے۔ مہری سے کہتے بابو جی نے بڑا رئیسانہ مزاج پایا ہے کوئی چیز لاؤ کبھی نہیں پوچھتے۔ کتنے کولائے بڑوں کے گھروں میں بڑے ہی پیدا ہوتے ہیں، بہو جی تو بال کی کھال نکالتی رہتی تھیں۔ مہری کا منہ پہلے ہی سی دیا گیا تھا۔ اس کے ڈھلے ہوئے حسن پر نئے مالک غیر معمولی طور پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے باہر کے دیوان خانے میں ہی منڈلایا کرتی۔ رتن کو ذرا بھی خبر نہ تھی۔ کس طرح اس کے خلاف قلعہ بندی ہو رہی ہے۔

ایک دن منی بھوشن نے رتن سے کہا۔ اب تو مجھے یہاں رہنا فضول معلوم ہوتا ہے میں سوچتا ہوں آپ کو لے کر گھر چلا جاؤں، وہاں آپ کی ہو آپ کی خدمت کرے گی بال بچوں میں جی بہل جائے گا۔ اور خرچ بھی کم ہو جائیگا۔ آپ کہیں تو یہ بنگلہ بیچ کر دوں اچھے دام اٹھیں گے۔

رتن اس طرح چونکی گویا کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا ہو۔ بولی۔ کیا مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو۔

منی بھوشن۔ جی ہاں کہہ رہا تھا کہ اب ہم لوگوں کو یہاں رہنا فضول ہے۔ اب تو یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔

رتن نے بے دلی سے کہا۔ ہاں اچھا تو ہوگا۔

منی۔ کاکا جی نے کوئی وصیت لکھی ہو۔ لائیے دیکھوں۔ ان کی مرضی ہمارے لئے مقدم ہے۔

رتن نے اسی طرح آسمان پر بیٹھے ہوئے گویا دنیا کی باتوں سے اُسے کوئی علاقہ نہیں ہے جواب دیا۔ وصیت تو نہیں لکھی اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟

منی بھوشن نے پھر پوچھا۔ شاید کہیں لکھ کر رکھ گئے ہوں۔

منی بھوشن نے دل میں خوش ہو کر کہا۔ میری خواہش ہے کہ ان کی کوئی یادگار بنوا دی

جائے۔

رتن نے خوش ہوکر کہا۔ میں بھی چاہتی ہوں۔

منی۔ گاؤں کی آمدنی کوئی تین ہزار روپیہ سال کی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے اتنا ہی وہ سال بھر میں خیرات کرتے تھے۔ دو ڈھائی سو سے کہیں مہینہ میں کم نہ ہوتا تھا۔ میری تجویز ہے کہ وہ ساری مدیں جیوں کی تیوں قائم رہیں۔

رتن نے اسی لہجہ میں کہا۔ ہاں اور کیا۔

منی۔ تو گاؤں کی آمدنی تو خیراتی کاموں کے لئے وقف کردی جائے۔ مکانوں کا کرایہ کوئی دو سو روپیہ ماہوار ہے۔ اس سے ان کے نام پر ایک چھوٹی سی سنسکرت پاٹھ شالہ کھول دی جائے۔

رتن۔ بہت اچھا ہوگا۔

اور یہ بنگلہ بیچ دیا جائے۔ اس روپیہ کو بینک میں رکھدیا جائے۔

رتن۔ بہت اچھا ہوگا۔ مجھے روپے پیسے کی اب کیا ضرورت ہے۔

منی۔ آپ کی خدمت کے لئے تو ہم سب حاضر ہی ہیں۔ موٹر بھی نکال دی جائے۔ ابھی سے یہ انتظام ہوگا تو جاکر کہیں دو تین مہینے میں فرصت ملے گی۔

رتن نے لاپروائی سے کہا۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ کچھ روپیہ بینک میں تو ہے۔

منی۔ بینک میں روپے تھے مگر مہینہ بھر سے خرچ بھی تو ہو رہے ہیں۔ ہزار پانچسو پڑے ہوں گے۔ یہاں تو روپے پیسے ہوا میں اڑجاتے ہیں۔ مجھ سے تو یہاں ایک مہینہ بھی نہ رہا جائے۔ موٹر کو بھی جلد ہی نکال دینا چاہیئے۔

رتن نے اس کے جواب میں بھی کہا اچھا تو ہوگا۔ وہ اس دماغی تعطل کی حالت میں تھی، جب انسان کو چھوٹے چھوٹے کام بھی اسوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں منی بھوشن کی کارپردازیوں نے اسے مغلوب کردیا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ جو شخص تھوڑی سی

ہمدردی ظاہر کردیتا۔ اسی کو وہ اپنا خیرخواہ سمجھنے لگتی۔ رنج و محن نے اس کے دل کو اتنا نازک اور نرم بنا دیا تھا کہ اس پر کوئی نقش بھی آسانی سے جم سکتا تھا۔ اس وقت سبھی اسے اپنے نظر آتے تھے۔ اسے کسی پر شبہ نہ تھا۔ کسی سے ضرر کا خوف نہ تھا۔ شاید کوئی چور بھی اس کے سامنے اس کا مال و متاع اٹھائے جاتا تو وہ شور نہ مچاتی۔

(٣٢)

تیرھویں کے بعد جالپا نے رتن کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ صرف ایک بار گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے چلی جایا کرتی تھی۔ ادھر کئی دنوں سے منشی دیا ناتھ کو بخار آنے لگا تھا۔ انہیں بخار ہی چھوڑ کر کیسے جاتی۔ منشی جی کو ذرا بھی بخار آجاتا تو وہ بک جھک کرنے لگتے تھے۔ کبھی گانے کبھی روتے۔ کبھی موت کے فرشتوں کو اپنے سامنے ناچتے دیکھتے۔ ان کا جی چاہتا کہ سارا گھر میرے پاس بیٹھا رہے۔ بلکہ رشتہ داروں کو بھی بلا لیا جائے تاکہ وہ سب سے آخری ملاقات کرلیں۔ کیونکہ اس بیماری سے بچنے کے انہیں کوئی امید نہ تھی۔ رامیشری اور سب کچھ کرسکتی تھی مگر ہرزہ سرائیاں نہ سن سکتی تھی۔ جیوں ہی وہ رونے لگتے وہ کمرے سے نکل جاتی اسے آسیب کا اندیشہ تھا۔

منشی جی کے کمرے میں کئی اخباروں کے فائل تھے یہی انہیں ایک شوق تھا۔ جالپا کا جی وہاں بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگتا تو ان فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ ایک دن اس نے ایک پرانے اخبار میں ایک شطرنج کا نقشہ دیکھا۔ جسے حل کردینے کے لئے کسی رئیس نے انعام دے رکھا تھا اسے خیال آیا کہ جس طاق پر رما ناتھ کی بساط اور مہرے رکھے ہوئے ہیں اسی پر ایک کتاب میں نقشے بھی دئے ہوئے ہیں۔ وہ فوراً دوڑتی اوپر گئی اور کتاب اٹھا لائی۔ یہ نقشہ اسی کتاب میں موجود تھا اور نقشہ ہی نہ تھا اس کا حل بھی دیا ہوا تھا۔ معاً جالپا کو یہ خیال پیدا ہوا۔ اس نقشہ کو کسی اخبار میں چھپوا دوں تو کیسا ہو۔ شاید رما ناتھ کی

نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہ نقشہ اتنا آسان تو نہیں ہے کہ آسانی سے حل ہو جائے۔ اس نے سوچا اس شہر میں جب ان کا ثانی کوئی نہیں ہے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت نہیں ہو سکتی۔ جو یہ نقشہ حل کر سکیں۔ کچھ بھی ہو جب رما ناتھ نے یہ نقشہ حل کیا ہے تو یقیناً وہ اسے پھر حل کریں گے جو لوگ پہلی بار دیکھیں گے انہیں سوچتے دو ایک دن ضرور لگ جائیں گے۔ جالپا نے اس نقشہ کو حل کرنے کے لئے کچھ انعام مقرر کر دینے کا فیصلہ کیا۔ جاتے ہی انہیں روپے نہ ملیں تاہم اتنا تو ممکن ہے ہی کہ حل کرنے والوں میں ان کا نام بھی ہو۔ اس طرح کچھ پتہ لگ جائیگا۔ کچھ بھی نہ ہو روپے ہی تو جائیں گے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ آج رتن سے نہ مل سکی۔ رتن دن بھر تو اس کی راہ دیکھتی رہی۔ جب وہ شام کو بھی نہ گئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ آج وہ شوہر کی وفات کے بعد پہلی بار گھر سے نکلی ہے۔ اسے تیز موٹر چلانے کی دھن تھی۔ لیکن آج موٹر کی رفتار تانگے سے بھی سست تھی۔ ایک بڑھیا کو سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھ کر اپنی موٹر کو روک دیا اور اسے چار آنے کے پیسے دے دیئے اور آگے بڑھی تو دو کانسٹبل ایک قیدی کو لئے جا رہے تھے اس نے موٹر روک کر ایک کانسٹبل کو بلایا اور اسے ایک روپیہ دے کر کہا۔ اس قیدی کو مٹھائی کھلا دینا۔ کانسٹبل نے سلام کر کے روپیہ لے لیا۔ آج کسی خوش نصیب کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا۔ جالپا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ معاف کرنا بہن! آج میں نہ آسکی۔ دادا کو کئی دن سے بخار آرہا ہے۔

رتن نے منشی جی کے کمرے کی طرف قدم اٹھایا اور پوچھا۔ وہیں ہیں نا۔ تم نے مجھ سے نہیں کہا۔

منشی جی کا بخار اس وقت کچھ اترا ہوا تھا۔ رتن کو دیکھ کر بولے۔ بہت رنج ہوا دیوی جی، مگر یہ تو دنیا ہے آج ایک کی باری ہے کل دوسرے کی باری ہے۔ چل چلاؤ لگا ہوا ہے اب میں بھی چلا۔ اب نہیں بچ سکتا۔ بڑی پیاس ہے جیسے سینے میں کوئی

بھٹی جل رہی ہو۔ پھنکا جاتا ہوں کوئی اپنا نہیں ہوتا دیبی جی! دنیا کے ناتے سب غرض کے ناتے ہیں، آدمی ہاتھ پسارے اکیلا ایک دن چلا جاتا ہے، رہا ہوتا تو آج ایک جلو پانی تو دیتا دو لونڈے ہیں انہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں مروں یا جیوں یہاں بیٹھتے دونوں کا دم گھٹتا ہے۔ آپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔

رتن نے تشفی دی۔ یہ ملیریا ہے لالہ جی! دو چار دن میں آپ اچھے ہو جائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

منشی جی نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ بیٹھ جائیے دیوی جی، آپ کی دعا ہے تو شاید بچ جاؤں لیکن مجھے تو امید نہیں ہے۔ میں بھی ٹال ٹھونک کر جم راج سے لڑنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ اسی طرح وہاں بھی کچہریاں ہیں حاکم ہیں۔ راجہ ہیں پرجا ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ اخبار نکلتے ہیں پھر کیا فکر ہے وہاں بھی الجھ ہو جاؤں گا۔

رتن کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ منشی جی مذاق میں یہ باتیں نہیں کر رہے تھے ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ متین تھا۔ آج ڈیڑھ دو مہینہ کے بعد رتن کو ہنسی آئی اور اس بے موقعہ ہنسی کو چھپانے کے لئے وہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ جالپا بھی باہر آ گئی۔

رتن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ دادا جی نے دل میں کیا سمجھا ہوگا سوچتے ہونگے میں تو جان سے مر رہا ہوں اور اسے ہنسی سوجھتی ہے اب وہاں نہ جاؤنگی۔ نہیں ایسی بات پھر کہیں تو میری ہنسی نہ رکے گی۔ دیکھو تو آج کتنی بے موقع ہنسی آئی ہے۔

جالپا نے اس کے دلی جذبات کو تاڑ کر کہا۔ مجھے بھی اکثر ان کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے۔ اس وقت ان کا بخار کچھ ہلکا ہے۔ جب بخار زور پر ہوتا ہے تو یہ اور بھی اول جلول بکتے ہیں۔ اس وقت ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج سویرے کہنے لگے میرا پیٹ

بیک ہو گیا۔ میرا پیٹ بھک ہو گیا۔ اس کی رٹ لگا دی۔ اس کا مطلب کیا تھا نہ میں سمجھ سکی نہ اماں سمجھ سکیں، مگر وہ برابر یہی رٹے جاتے تھے آؤ کمرے میں چلیں۔

رتن۔ میرے ساتھ نہ چلو گی۔

آج تو نہ چل سکوں گی۔

کل آؤں گی۔

کہہ نہیں سکتی دادا کی طبیعت اچھی رہی تو آؤں گی۔

نہیں بھائی ضرور آنا۔ تم سے ایک صلاح کرنا ہے۔

کیا صلاح ہے۔

منی کہتے ہیں یہاں رہنا اب فضول ہے۔ ان کی صلاح ہے بنگلہ بیچ دیا جائے، اور ہم لوگ مالوہ چلے جائیں۔

جالپا تعجب سے بولی۔ یہ تو تم نے بُری خبر سنائی بہن۔ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔ میں نہ جانے دوں گی منی سے کہہ دو بنگلہ بیچ دیں، مگر جب تک بابو جی کا پتہ نہ لگ جائے میں نہیں نہ جانے دوں گی۔ تم کل ایک ہفتہ باہر رہیں مجھے ایک ایک پل پہاڑ ہو گیا۔ اب تو شاید میں ہی مر جاؤں۔ نہیں بہن تمہارے پیروں پڑتی ہوں ابھی جانے کا نام نہ لو۔

رتن بھی آبدیدہ ہو کر بولی۔ مجھ سے بھی وہاں نہ رہا جائے گا۔ سچ کہتی ہوں تو منی سے کہہ دونگی مجھے نہیں جانا ہے۔ جالپا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں لے گئی۔ اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر طفلانہ انداز سے بولی۔ قسم کھاؤ کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی۔

رتن نے اُسے آغوش میں لے کر کہا۔ تو قسم کھاتی ہوں نہ جاؤں گی۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ میرے لئے وہاں کیا رکھا ہے بنگلہ بھی کیوں بیچوں، دو ڈھائی سو مکانوں کا کرایہ ہے۔ ہم دونوں کے گزارے کے لئے کافی ہے، میں ابھی منی سے

کہہ دوں گی۔

دفعتہً فرش پر مہرے اور شطرنج کے نقشہ کو دیکھ کر پوچھا۔ یہ شطرنج کس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔

جالپا نے شطرنج کے نقشہ پر اپنی تقدیر کا پانسہ پھینکنے کی جو تجویز سوچی تھی وہ اسے کہہ سنائی۔ دل میں ڈر رہی تھی کہ رتن کہیں اس تجویز کو پاگل پن نہ خیال کرے۔ لیکن رتن سنتے ہی باغ باغ ہوگئی بولی۔ دس روپے کا انعام تو بہت کم ہے بچا میں روپے کر دو۔ روپے میں دیتی ہوں۔

جالپا نے اعتراض کیا۔ تب تو بڑے بڑے شطرنج باز میدان میں آجائیں گے۔

رتن۔ کوئی مضائقہ نہیں بابو جی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ اسے ضرور حل کر لیں گے اور مجھے امید ہے سب سے پہلے انہی کا نام آوے گا۔ کچھ نہ ہوگا تو پتہ تو لگ ہی جائے گا۔ تم نے بڑی اچھی تدبیر سوچ نکالی۔

جالپا نے پوچھا تو نہیں اُمید ہے۔

پوری۔ میں کل سویرے روپے لے کر آؤں گی۔

تو میں آج خط لکھ رکھوں گی۔ کسی مشہور اخبار میں بھیجنا چاہیئے۔

کلکتہ میں تو زیادہ تر لوگ بشو متر ہی پڑھتے نظر آتے تھے۔

اسی وقت منشی جی پکار اٹھے۔ بُہو! بُہو!

جالپا تو لپکی ہوئی ان کے کمرے کی طرف چلی۔ رتن باہر جا رہی تھی کہ جاگیشری پنکھا جھلتی نظر آئی۔ رتن نے پوچھا تمہیں گرمی لگ رہی ہے اماں جی! میں تو مارے سردی کے کانپ رہی ہوں۔ ارے تمہارے پاؤں میں یہ کیا سفید لگا ہوا ہے؟ کیا آٹا پیس رہی تھیں۔

جاگیشری نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ہاں۔ ویدجی نے انہیں ہاتھ کے آٹے کی روٹی کھانے کو

کہا ہے بازار میں ہانید کا آٹا کہاں میسر۔ محلہ میں کوئی پسنہری نہیں ملتی۔ مزدورنیں تک چکی میں آٹا پسوا لیتی ہیں۔ کوئی ملتی ہی نہیں۔

رتن نے تعجب سے پوچھا، تم سے چکی چل جاتی ہے۔

جاگیشری مسکرا کر بولی، کون بہت سا گیہوں تھا، پاؤ بھر تو دونوں وقت کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں کھاتے۔ بہو پیسنے جا رہی تھی مگر پھر مجھے ان کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ مجھے رات چکی پینا منظور ہے۔ ان کے پاس گھنٹے بھر بیٹھنا منظور نہیں۔ رتن جا کر جانت کے پاس ایک منٹ کھڑی رہی پھر مسکرا کر ماچی پر بیٹھ گئی اور بولی تم سے تو یہ جانت نہ چلتا ہوگا۔ ماں لاؤ تھوڑا سا گیہوں مجھے دو، دیکھوں تو۔

جاگیشری نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ارے نہیں بہو، تم کیا پیسو گی چلو یہاں سے۔

رتن نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ میں نے بہت دنوں تک پیسا ہے اماں۔ جب اپنے گھر تھی تو روز پیستی تھی لاؤ تھوڑا سا گیہوں دو۔

ہاتھ دکھنے لگے گا۔ چھالے پڑ جائیں گے۔

کچھ نہیں ہوگا اماں جی! آپ گیہوں تو لا دیجئے۔

جاگیشری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا۔ گیہوں گھر میں نہیں ہے۔ اب اس وقت بازار سے کون لا دے۔ رتن کو اعتبار نہ آیا۔ بولی، اچھا چلئے میں آپ کے بھنڈارے میں دیکھوں ہوگا کیسے نہیں۔

رسوئی کی بغل والی کوٹھری میں کھانے کا سامان رہتا تھا۔ رتن اندر چلی گئی اور ہانڈیوں میں ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ ایک ہانڈی میں گیہوں نکل آئے خوش ہو کر بولی، دیکھو اماں نکلے کہ نہیں، تم مجھ سے بہانہ کر رہی تھیں۔

اس نے ایک ڈلیا میں تھوڑے سے گیہوں نکال لئے اور خوش خوش جانت پر جا کر پیسنے لگی۔ جاگیشری نے جا کر جالپا سے کہا۔ بہو وہ جانت پر بیٹھی گیہوں پیس رہی

ہے اٹھاتی ہوں اٹھتی ہی نہیں۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے۔

جالپا نے منشی جی کے کمرے سے نکل کر ساس کی پریشانی کا مزہ اٹھانے کے لئے کہا۔ یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اماں سچ مچ کوئی دیکھ لے تو ناک ہی کٹ جائے چلئے دیکھوں۔

جاگیشری نے مجبوری انداز سے کہا۔ میں تو سمجھا کے ہار گئی مانتی ہی نہیں۔

جالپا نے جا کر دیکھا تو رتن گیہوں پیسنے میں مگن تھی۔ تفریح کی فطری مسرت سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں اس کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں آ گئی تھیں۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں جانت لٹو کی طرح ناچ رہی تھی۔

جالپا نے ہنس کر کہا۔ اوری آٹا مہین ہو۔ ورنہ پیسے نہ ملیں گے۔

رتن کو سنائی نہ دیا۔ بہروں کی طرح اس کے منہ کی طرف تاک کر مسکرائی۔ جالپا نے اور زور سے کہا۔ آٹا خوب مہین پیسنا نہیں تو پیسے نہ ملیں گے۔

رتن نے بھی ہنس کر کہا۔ جتنا مہین کہیئے اتنا مہین پیس دوں بہو جی۔ پسائی اچھی ملنی چاہیئے۔

جالپا۔ دھیلے سیر۔

رتن۔ دھیلی سیر سہی۔

منہ دھو آؤ۔ دھیلے سیر ملے گی۔

میں یہ سب پیس کر اٹھوں گی تم یہاں کھڑی رہو۔

آجاؤں میں بھی پھچوا دوں۔

جی چاہتا ہے کوئی جانت کا گیت گاؤں۔

جالپا نے جا گیشری کو منشی جی کے کمرے میں بھیج دیا اور جانت پر جا بیٹھی۔ دونوں سہیلیاں یہ گیت گانے لگیں۔

موہے جوگن بنا کے کہاں گئے رے جوگیا

دونوں کے گلے میں لوتج تھا جانت کا گھنگرو گھنگران کے گیت پر ساز کا کام دے رہا تھا۔ جب دونوں ایک کڑی گا کر خاموش ہو جاتیں تو جانت کی آواز گویا گیت کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر اور بھی دلکش ہو جاتی تھی۔ دونوں کے دل اس وقت مسرتِ حیات کے فطری سرور سے پر تھے نہ غم کا بوجھ تھا نہ فراق کی کشش۔ گویا دو چڑیاں طلوع سحر کی کیفیتوں سے مست ہو کر چہک رہی تھیں۔

(۳۳)

رمانا تھ کی چائے کی دکان کھل تو گئی مگر صرف رات کو کھلتی تھی۔ رات کو بھی زیادہ تر دیبی دین ہی دکان پر بیٹھتا لیکن بکری اچھی ہو جاتی تھی۔ پہلے دن تین روپے کے پیسے آئے دوسرے دن چار پانچ روپے کا اوسط پڑنے لگا۔ چائے اتنی لذیز ہوتی تھی کہ جو ایک بار یہاں چائے پی لیتا پھر دوسری دکان پر نہ جاتا۔ رمانے کچھ تفریح کا سامان بھی جمع کر دیا چراغ جلنے کے بعد سبزی کی بکری زیادہ نہ ہوتی تھی وہ ان ٹوکروں کو اٹھا کر اندر رکھ دیتا اور برآمدے میں میز لگا دیتا۔ اس پر تاش کا سٹہ رکھ دیتا دو روزانہ اخبار بھی منگانے لگا۔ دکان چلنے لگی۔

ان چار پانچ مہینوں کے افلاس نے رمانے کے ذوق تن پروری کو اور بھی تیز کر دیا تھا جب تک روپے نہ تھے وہ مجبور تھا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی سیر و تفریح کا جنون سر پر سوار ہو گیا، سینما کی بھی یاد آئی روزمرہ کی جن ضروریات کو وہ اب تک ٹالتا آتا تھا خریدی جانے لگیں۔ دیبی دین کے لئے ایک خوشنما ریشمی چادر لایا، جگو کے سر میں اکثر درد ہوتا رہتا تھا ایک دن تیل کی خوشبودار دو شیشیاں لا کر دے دیں۔ دونوں نہال ہو گئے۔ اب بڑھیا کبھی اپنے سر پر بوجھ لادتی تو اسے ڈانٹتا۔ اب تو میں بھی چار پیسے کمانے لگا ہوں اب تو کیوں جان دیتی ہے، اگر پھر کبھی تیرے سر پر ٹوکری دیکھی تو کہے دیتا ہوں دکان اٹھا کر

پھینک دونگا۔ بڑھیا لڑکے کی یہ ڈانٹ سُن کر باغ باغ ہوجاتی۔ منڈی سے بوجھ لاتی تو پہلے چپکے سے دیکھتی، رما دکان پر تو نہیں ہے اگر وہ بیٹھا ہوتا تو کسی قلی کو ایک دو پیسے دے کر اس کے سر پر رکھ دیتی۔ وہ نہ ہوتا تو ٹوکری ہوئی آتی اور جلدی سے بوجھ اتار کر اطمینان سے بیٹھ جاتی۔ تاکہ رما بھانپ نہ سکے۔

ایک دن منور ما تھیٹر میں آغا حشر کا کوئی نیا ڈرامہ آنے والا تھا۔ اس ڈرامہ کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ایک دن پہلے ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہیں ریزرو کرا رہے تھے۔ رما کو بھی اپنی جگہ ریزرو کرانے کی دھن سوار ہوئی۔ سوچا کہیں رات کو ٹکٹ نہ ملا تو ٹاپتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ اشتیاق پولیس کے خوف پر بھی غالب آگیا ایسی آفت نہیں آئی ہے کہ گھر سے نکلتے ہی پولیس گرفتار کرلے۔ دن کو نہ سہی رات کو نکلتا ہی ہوں۔ پولیس چاہتی تو کیا رات کو نہ گرفتار کرلیتی۔ پھر میرا وہ حلیہ بھی نہیں رہا۔ تبدیل ہیئت کے لئے پگڑی کافی ہے۔ یوں دل کو سمجھا کر وہ دس بجے گھر سے نکلا۔ دیبی دین کہیں گیا ہوا تھا بڑھیا نے پوچھا، کہاں جاتے ہو بیٹا!

رما نے کہا۔ کہیں نہیں ابھی آتا ہوں۔

رما سڑک پر آیا تو اس کی ہمت برف کی طرح پگھلنے لگی۔ قدم قدم پر خوف ہوتا تھا کوئی کانسٹبل نہ آرہا ہو۔ اُسے یقین تھا کہ پولیس کا ایک ایک چوکیدار بھی اس کا حلیہ پہچانتا ہے اس لئے وہ سر نیچے جھکائے چل رہا تھا۔ دفعتہً اسے خیال آیا خفیہ پولیس کے جاسوس سادہ لباس میں اِدھر اُدھر گھوما کرتے ہیں۔ کون جانے جو آدمی میری بغل میں آرہا ہے کوئی جاسوس ہی ہو۔ میری طرف کتنے غور سے دیکھ رہا ہے یوں سر جھکا کر چلنے ہی سے شاید اسے شبہ ہو رہا ہے یہاں اور سبھی آدمی سامنے دیکھ رہے ہیں کوئی یوں سر جھکا کر نہیں چل رہا ہے۔ موٹروں کی ریل پیل میں سر جھکا کر چلنا موت کو دعوت دینا ہے۔ پارک میں کوئی اس طرح چہل قدمی کرے تو کر سکتا ہے یہاں تو نگاہ سامنے ہونا چاہیئے

لیکن بغل والا آدمی ابھی تک میری ہی طرف تاک رہا ہے۔ ہے کوئی خفیہ ہی۔ رما اس کا ساتھ چھوڑنے کے لئے ایک تنبولی کی دکان پر پان کھانے لگا۔ وہ آدمی آگے نکل گیا رما نے آرام کی لمبی سانس لی۔

اب اس نے سر اٹھا لیا۔ اور دل مضبوط کرکے چلنے لگا۔ اس وقت ٹرام کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ نہیں تو اس پر بیٹھ لیتا۔ تھوڑی ہی دور چلا ہوگا کہ اسے تین کانسٹبل پیچھے سے آتے دکھائی دیئے۔ اس نے سڑک چھوڑ دی اور پٹری پر چلنے لگا۔ خواہ مخواہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالنا کونسی بہادری ہے مگر وائے نصیب تینوں کانسٹبلوں نے بھی سڑک چھوڑ دی اور پٹری لے لی۔ رما کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ دوسری پٹری پر جانا اس شبہ کو اور بھی طاقت پہنچائیگا۔ کوئی ایسی گلی بھی نہیں جس میں گھس جائے۔ اب تو سب بہت قریب آگئے کیا بات ہے کہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں میں نے بڑی حماقت کی کہ یہ پگڑ باندھ لیا اور باندھا بھی کتنے بے تکے پن سے ایک ٹیلہ سا اوپر اٹھ گیا ہے۔ یہ پگڑی آج مجھے پکڑائے گی ضرور باندھی تھی اس سے صورت بدل جائے گی۔ یہ الٹے اور تماشہ بن گئی۔ تینوں میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ شاید میرا حلیہ ملا رہے ہیں اب نہیں بچ سکتا۔ گھر والوں کو میری گرفتاری کی خبر ملے گی تو کتنے شرمندہ ہونگے۔ جالپا تو رو رو کر جان دیدے گی پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔ بس زندگی کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اس تخیل کا اس کے دل پر ایسا غلبہ ہوا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ جب کانسٹبلوں کی جماعت قریب آگئی تو اس کا چہرہ خوف سے کچھ ایسا تبدیل ہو گیا آنکھوں میں کچھ ایسا خوف نمودار ہو گیا اور وہ کچھ اس طرح دوسرے آدمیوں کی آڑ تلاش کرنے لگا کہ عام آدمیوں کو اس پر شبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر پولیس والوں کی منجی ہوئی آنکھیں کیوں چوکتیں۔ ایک نے رمانا تھ کو للکارا۔ او جی۔ او بکری ذرا ادھر آنا۔ تمہارا نام کیا ہے!

رمانا تھ نے سینہ زوری کے انداز سے کہا۔ ہمارا نام پوچھ کر کیا کروگے۔ کیا میں چور

ہوں؟

چور نہیں رتم شاہ سہی، نام کیوں نہیں بتاتے؟

رمانے ایک لمحہ کے بعد سل رنج کے ساتھ کہا۔ ہیرالال۔

گھر کہاں ہے۔

گھر۔

ہاں گھر ہی پوچھتے ہیں۔

شاہجہاں پور۔

کون محلہ؟

رما شاہجہاں پور نہ گیا تھا۔ نہ اتنی جرأت ہوئی کہ کوئی فرضی ہی نام بتا دے۔ دلیری سے بولا۔ تم تو گویا میرا حلیہ لکھ رہے ہو۔

کانسٹبل نے بھبکی دی۔ تمہارا حلیہ پہلے ہی لکھا ہوا ہے نام جھوٹ بتایا۔ سکونت جھوٹ بتائی۔ محلہ پوچھا تو بغلیں جھانکنے لگے۔ مہینوں سے تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ آج جا کر ملے ہو۔ چلو تھانے پر۔

یہ کہتے ہوئے اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رمانے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وارنٹ لاؤ تب میں چلونگا۔ کیا مجھے کوئی دیہاتی سمجھ لیا ہے۔

کانسٹبل نے اپنے ساتھی سے کہا۔ پکڑ لو جی ان کے ہاتھ۔ وہیں تھانے پر وارنٹ دکھایا جائے گا۔

شہروں میں وارداتیں مداری کے تماشے سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ شامت کا مارا دیپ دین اسی وقت افیم لے کر لوٹ رہا تھا۔ یہ جمگھٹ دیکھ کر وہ بھی آ گیا۔ دیکھا کہ تین کانسٹبل رماناتھ کو گھسیٹے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر بولا۔ ہائیں ہائیں جمعدار یہ کیا کرتے ہو۔ پنڈت جی تو ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں کہاں

پکڑے لئے جاتے ہو۔

کانسٹبل دینی کو پہچانتے تھے ایک نے پوچھا۔ تمہارے مہمان ہیں یہ کب سے ؟

دینی دین نے دل میں حساب لگا کر کہا۔ چار مہینے سے کچھ زیادہ ہی ہوئے ہونگے۔ مجھے پراگ راج میں مل گئے تھے رہنے والے دلی وہیں کے ہیں۔ میرے ساتھ ہی تو آئے تھے۔

کانسٹبل نے دل میں خوش ہو کر کہا۔ ان کا نام کیا ہے۔

دینی دین نے سٹ پٹا کر کہا نام انہوں نے بتایا نہ ہوگا۔

کانسٹبلوں کا شبہ پختہ ہو گیا۔ ایک کانسٹبل نے آنکھیں نکال کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم بھی ملے ہوئے ہو۔ ان کا نام کیوں نہیں بتلاتے۔

دینی دین نے شبہ انگیز جسارت کے ساتھ کہا۔ مجھ سے رعب نہ جماتا جمعدار سمجھے یہاں دھمکیوں میں نہیں آنے کے۔

دوسرے کانسٹبل نے گویا ثالث بن کر کہا۔ بوڑھے بابا تم خواہ مخواہ بگڑ رہے ہو ان کا نام کیوں نہیں بتا دیتے۔

دینی دین نے خائف نظروں سے رما کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم لوگ تو رما ناتھ کہتے ہیں۔ اصلی نام کچھ اور ہے یا یہی ہم نہیں جانتے۔ کانسٹبل نے آنکھیں نکال کر کہا۔ بولو پنڈت جی کیا نام ہے تمہارا رما ناتھ یا ہیرالال یا دونوں۔ ایک گھر کا ایک سسرال کا۔

تیسرے کانسٹبل نے تماشائیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ نام ہے رما ناتھ بتاتے ہیں ہیرالال ہے۔ مگر الہ آباد بتاتے ہیں شاہجہاں پور۔ جرم ثابت ہو گیا۔

تماشائیوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

شبہ کی بات تو ہے۔

صاف ہے نام اور پتہ دونوں غلط بتائے۔